خودی باب حق ھے

ضامن نقوی

علم و ادراک یا عرفان و شہود حقائق کے دو راستے ھیں—ایک بواسطہ' حواس، تجربات و قیاس سے آگے بڑھنے والا راستہ اور دوسرا شعور ذات، خودی یا خود آگاھی کے واسطے سے تحت‌الشعور سے فوق‌الشعور کی طرف جانے والا راستہ۔

انسان کا وہ نقطہ' شعور ذات جسے خود (Self) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ھے دراصل حقیقت و عرفان کا باب الداخلہ ھے۔ یہ اپنی ذات میں نہ کوئی وھمی و خیالی شے ھے، نہ محتاج دلیل و حجت۔ ھر شخص اپنی امتیازی شخصیت اپنے تمام اعمال ارادی، سکوت و کلام، سعی' حصول مقاصد اور تکمیل مقاصد کے لئے غور و فکر میں محسوس کرتا ھے، ھر با خبر یہ سمجھتا ھے کہ اسکی زندگی کے ظاھری اور باطنی نظام میں اسکی حیثیت اعضا کی طرح صرف ایک آلہ' کار کی سی نہیں بلکہ اس محرک اعمال ارادی کی سی ھے جو زندگی کی پوری مشینری سے حسب مراد وہ کام لیتا ھے جسکے لئے اس مشینری کا ھر پرزہ فطرتاً موزوں ھے۔ یہ ھے تصور و تاثر شخصیت و شعور ذات جسکا مرکز خود انسان کی وہ ذات ھے جسکو وہ لفظ ھم یا میں سے تعبیر کرتا ھے مگر یہ احساس و امتیاز خود بخود نہیں، خدا کا پیدا کیا ھوا قلب بشر یا نفس انسانی میں ھے۔ اس راز ھستی کی طرف آیت قرآنی فی انفسکم افلا تبصرون میں اشارہ کیا گیا ھے۔ اس مرکز شعور ذات سے اس راہ علم و عرفان کے راستے کا آغاز ھوتا ھے جسے راہ داخلیت یا خود شناسی بمعنی خدا شناسی کہتے ھیں۔

انسانی خودی، انسان کے نظام زندگی میں قابل اشارۂ حسی نہیں، اسکا کوئی مقام اس نظام میں متعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو آپ کہہ سکتے ھیں کہ صرف دل دماغ ھی نہیں زندگی کا پورا نظام احساس و ادراک یعنی حیات شاعرہ شعور ذات یا خودی سے وابستہ ھے مگر خودی کو آپ کوئی کیفیت حاصل ترکیب و ترتیب نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ تمام نظام اعمال ارادی تابع ھے آپ کی ذات (انائے شخصی) کے، آپ کی ذات اس نظام اعمال کی تابع و پابند نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کوئی مشین جسکی محرک قوت برقی ھو یا قوت برقی کو اس مشین کے نظام کی جس طرح کوئی تابع قوت نہیں

سمجھا جا سکتا ہے اسی طرح انسان کے نفس یا انائے شخصی یا خودی کو نظام زندگی کی تابع کرنی قوت نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ بہرحال محرک اور متحرک کے فرق کا امتیاز اپنے مقام پر نمایاں رہیگا۔

تعریف و تعارف اشیائے کائنات میں، انسانی علم و ادراک کا اکثر و بیشتر سرمایہ اشیاء کے باہمی اشتراک و اختلاف کا امتیاز ہے۔ کون سی چیز کس حد تک دوسری چیزوں سے مشابہ ہے اور کس حد تک غیر مشابہ؟ منطقیانہ طریق تعریف اشیا یا امتیاز ماہیت میں اسی جستجو کا نام تلاش جنس و فصل ہے مگر نفس انسانی یا اسکے تکیف یعنی خودی کو عالم موجودات کی کسی دوسری شے سے کس طرح تشبیہ دی جاسکتی ہے جب عالم کم و کیف میں کوئی شے بھی اسکے مانند و مماثل نہیں پائی جاتی ہے؟ مسئلہ ہے ایک ذی شعور محرک کا۔ عالم فطرت میں جتنی آلۂ کار قوتیں انسان کے علم میں آتی ہیں مثلاً برق و مقناطیس، جوہری توانائی، دخانی و غازیاتی فعلیت، ان میں سے کوئی قوت محرک بھی، محرک ذی شعور، قصد اور ارادے کے ساتھ کام کرنے والی نہیں ہے۔ اس پر ان تمام طبعی قوتوں کو قیاس کیجئے جن سے فطرت تدبیر و تصرف کا کام نظام کائنات میں لے رہی ہے۔ یہ تمام طبعی قوتیں اس شعور ہی کے ماتحت کام کر رہی ہیں جو فطرتاً تدبیر و تنظیم کے لئے ضروری ہے اور جس کا کوئی عمل بھی بے غایت و مقصد نہیں ہے

اس مقام امتیاز سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فطرت کائنات ایک انائے کلی ہے اور انسانی خودی انائے جزوی مگر اس جز و کل میں کوئی ریاضیاتی نسبت توازن نہیں ہے۔ دونوں میں وہی مناسبت ہے جو نور و تنویر میں پائی جاتی ہے یا موج و دریا میں۔ حاصل کلام یہ کہ خودی یا انائے بشری کے مماثل کوئی دوسری شے عالم کیف و کم میں نہیں پائی جاتی ہے۔ با الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انائے بشری ماورائے عالم کم و کیف ہے۔ پھر جب یہ جزوی انائے بشری ماورائے عالم کم و کیف ہے تو انائے کلی جس کی ایک جھلک میں انائے انسانی ہے وہ کیوں نہ ہر تشبیہ و تمثیل سے ماوریٰ سمجھی جائے؟ اور یہ سلسلۂ ماورایت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ جز و کل کے تصورات تعینات ہی ہیں۔ اس لاتعین وجود مطلق کو جو خود بخود ہے، انائے کلی و جزوی دونوں میں جس کی ذات کی صرف ایک جھلک ہی ہے، اسے کیوں ماورائے عالم متعین نہ سمجھا جائے۔ عالم خلق محدود، وہ نا محدود، کائنات حادث وہ قدیم، کائنات مخلوق، وہ خالق، دنیا محتاج، وہ غنی اور صمد،

کائنات سے وہ ماورئ ہے، کائنات کیا شے ہے جسے خدا سے ماورئ سمجھا جاسکے؟ اگر مخلوق کو خالق سے ماورئ مانا جاسکتا ہے تو العیاذاً باللہ آدمی کو بھی خدا سے ماورئ سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر بالفرض محال حقیقت یہی ہے تو عبدیت کا نام و نشان کہاں باقی رہا!

یہ ہے ہماری نظر میں مسئلہ' ماورایت کی کچھ شرح و تفصیل، ورنہ پوری تفصیل کے لئے ایک عالم کیا اگر بے شمار عالم بھی سامنے آتے ہیں تو حضور ماورائے مطلق میں سر بسجدہ ہی پائے جائینگے ع حد ادراک سے باہر ہے ہمارا مسجود۔ تو ہم کہ یہ رہے تھے کہ مسئلہ وحدت شہود میں اعتراف ماورایت تو واضح ہے۔ حضرت مجدد صاحب کا یہ قول انکے مکتوبات میں جابجا ملتا ہے کہ'' ثم وراء الورئ ثم وراء الورائ،، ۔ مگر اس راز کا کوئی انکشاف نظر نہیں آتا ہے کہ خدا نے کس شے سے کائنات کو پیدا کیا۔ عدم کا تو کوئی وجود نہیں ہوتا ہے کہ جس سے کوئی شے پیدا کی جاسکتی ہو۔ یہ تو صحیح ہے کہ کائنات حادث موخر با لعدم ہے یعنی کائنات جو کوئی قدیم شے نہیں ہے، کوئی زمانہ ایسا تھا کہ وہ نہیں تھی مگر شمع بزم قدم وہ ذات واحد ہی تھی جس کا تقدم تمام عالم آفرینش پر مسلم ہے، قدیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے،دو نہیں ہوسکتے۔ کائنات مخلوق ہے خدا نہیں، خدا کا کوئی دوسرا نہیں، وحدہ لا شریک لہ۔

شے سے شے پیدا ہوتی ہے۔ یہ کلیہ جوتجربی و استقرائی ہے علم و ادراک بشری کی جان ہے مگر شے کے معنی اس کلیہ میں واضح نہیں۔ کیا شے اسی چیز کو کہہ سکتے ہیں جو محدود ابعاد ثلاثہ یا متحیز ہو یعنی جو کوئی جگہ گھیرے یا جو کم و کیف کی حد بندیوں کے اندر ہی پائی جائے؟ پھر کیا انائے بشری (خودی) اس قسم کی کوئی شے ہے جو متحیز یا محدود ابعاد ثلاثہ (عرض و طول و عمق) ہو یا جو کوئی مرکب کم و کیف ہو؟ یقیناً خودی کوئی ایسی شے تو نہیں ہے مگر اس کا کوئی وجود یقیناً ہے، اسے ہم لا شے نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ہماری حیات شاعرہ کی ایک ایسی اساس ہے جسکے بغیر قصد اور ارادے کی عمارت تعمیر ہی نہیں ہوسکتی۔ داخلیت یا نفسیاتی نقطہ نظر سے اس مسئلہ کی صحت کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ انائے بشری سے اسکے ارادوں کا تعلق کیا ہے اور اسکے ارادوں کی ماہیت کیا ہے ؟ ہر ارادہ ایک جنبش نفسی ہوتا ہے مگر اس جنبش کا مفہوم بھی وہ نہیں ہے جسکی مثال کسی مشین کے پرزوں کی جنبش سے دی جاسکے۔ جب آپ کوئی بات سوچتے ہیں تو نہ آپ کا ذہن نفسی ہلتا ہے نہ اسکے تابع آپکے نتائج فکری۔ البتہ

کچھ تصورات مخفی (تحت الشعوری) معرض ظہور میں ضرور آ جاتے ہیں۔ یہی صورت تمام مخفیات نفسی کی ہے۔ اس تمہید کے بعد ہمیں یہ کہنا ہے کہ خالق کائنات نے اپنے ارادے سے کائنات کو پیدا کیا۔ جب وہ کسی شے کی تکوین کا ارادہ کرتا ہے تو وہ شے ارادے کے ساتھ ہی معرض ظہور میں آ جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں راز تخلیق سے یوں پردہ اٹھایا گیا ہے: کن فیکون۔ باری تعالیٰ کے ہر ارادے اور مراد میں نسبت بے مثال ہے۔ ہم اپنے ارادوں پر ذات باری کے ارادوں کو قیاس نہ کریں۔ انسانی ارادے براہ راست تخلیق و تشکیل مراد نہیں کرسکتے ہیں، ذرائع اور وسائط کے محتاج ہوتے ہیں مگر خالق کا ارادہ تشکیل مراد میں تابع اسباب نہیں ہوتا ہے، اس کا ارادہ براہ راست تخلیق کی صورت پیدا کردیتا ہے ع اسکی خلاقی تعجب خیز ہے۔ باری تعالیٰ کے ارادۂ تخلیق ہی نے متمثل ہوکر عمارت آفرینش کی بنا ڈالی ہے، وجود کائنات امتثال امر ہی ہے، لہ الخلق والامر۔

خودی امر ہے اور خدائی خلق ع خودی کے پردے میں ہے خدائی۔ اسلام دین فطرت ہے یعنی یہ تاثر کہ دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے اس منزل ارتقائے حیات سے جزو فطرت انسانی ہے کہ جہاں سے انسان میں اسکے شعور ذات نے کچھ کچھ آنکھ کھولی ہے۔ لیکن وہ کون ہے، کیسا ہے اور کہاں ہے؟ اس مسئلہ میں فکر انسانی نے اپنے بلوغ سے پہلے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ جس قدر مشرکانہ توہمات نسل انسانی میں پائے گئے ہیں وہ سب فکری گمراہیوں ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ چاند سورج کی پوجا، عناصر سے بھیک مانگنا، خیالی دیوتاؤں کے سامنے دامن پھیلانا، بتوں کے سامنے قربانیاں اور چڑھاوے اور اس قسم کے جملہ خرافات کی بنیاد کس شے پر ہے؟ صرف اس جہل پر ہے جو اس تاثر کے بعد کہ دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ کون ہے اور کون ہوسکتا ہے۔ مگر اس جہل کا ازالہ اسی رفتار سے ہوا جس رفتار سے انسان میں اسکے شعور نے آنکھ کھول کر ظلمت کو نور سے تبدیل کیا ہے۔ وسعت فکر و نظر مرہون بصیرت نفس ہے۔ جتنی بصیرت بڑھی اتنی نظر وسیع ہوئی، فکر بڑھی، جہالت کے پردے آنکھوں سے اٹھے۔ مگر یہ ارتقا بتدریج اور رفتہ رفتہ ہی ہوا۔ عقیدۂ توحید کامل ایک انتہائی ترقی یافتہ عقیدہ ہے جسکے لئے جب تک کوئی شعاع عرفان نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور نگاہ مشہود ابراہیمی علیہ السلام میسر نہ ہوئی، آدمی کی نگاہ سے پورےطور پر حجابات ظلمانی نہ اٹھ سکے۔ کفر، شرک، الحاد، لادینی یہ سب کے سب ظلمتوں کے نشانات ہی تو ہیں۔

بلاشبہ انواع موجودات کی درجہ بندی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فطرت نے منزل مقصود تخلیق کی طرف کاروان حیات کو درجہ بدرجہ ہی بڑھایا ہے۔ نظریۂ ارتقائے حیات کوئی واہمہ نہیں ہے۔اس اجمال کی کچھ تفصیل آثار قدیمہ کی تحقیق اور بعض انکشافات طبیعی کے ذیل میں معلوم ہوتی ہے۔ اسی ضمن میں یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ آدمی کرۂ ارض پر کب سے پایا جاتا ہے۔ یہ متمدن آدمی زیادہ عرصہ سے دنیا میں آباد نہیں ہے۔ آدم کو جس سے اسکی نسل چلی ہے مذہبی روایات کے مطابق چھ سات ہزار سال ہی ہوئے مگر ان سے بہت پہلے یعنی عہد حجری سے بھی پہلے والی کئی آدمی نما نسلیں کرۂ ارض پر اپنے کچھ نشانات چھوڑ گئی ہیں۔ سنگ خارا کے نیزے اور بلم بھی انہیں نشانات ماضیہ میں شامل ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ سب سے پہلی انتہائی وحشی آدمی نما نسل آج سے کئی لاکھ سال پہلے اس دور میں کرۂ ارض پر کہیں کہیں منتشر حالت میں تھی۔ جب ہیبت ناک صحرائے دنیا، خونخوار درندوں، شعلہ بار اژدھوں اور دلدلوں کے سمندروں میں ایسے خوفناک حشرات الارض کا مسکن تھا کہ جنکی صورتوں کا تصور بھی بیسویں صدی کے انسان کو خوف زدہ کردے پھر چاروں طرف وہ درخت کہ جن کی بلندی آسمان کو چھونا چاہتی تھی اور اس صحرائے مہیب کی وہ تاریک فضا جسنے زمانہ سے روشنی کا منہ نہیں دیکھا تھا، آفتاب بھی جسکی طرف سے نظر بچا کر اور منہ چھپا کر نکلتا تھا— تو یہ اسی عہد کی آدمی نما ہستی کا کلیجہ تھا کہ وہ اس فضا کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مگر وہ جامد دماغ اور پتھرکا کلیجہ اپنے سینے میں رکھتا تھا، آج کل کا ذکی الحس، نازک مزاج آدمی نہیں تھا۔ اسکے اعصاب فولادی تھے، اسکی رگوں میں معتدل خون کے بجائے طبیعت ناریہ کا طوفان موجزن معلوم ہوتا تھا۔ ایسا آدمی نما کمال اور شعور ذات (سرچشمۂ علم و ادراک) کہاں، وہ تو تمام حیوانی دنیا کا ایک سب سے بڑا مدمقابل حیوان ہی تھا۔ سب سے پہلی برفباری نے جسنے کرۂ ارض کی حیات طبیعی کو الٹ پلٹ کر رکھدیا اس آدمی‌نما نسل کا بڑا حصہ فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ قانون بقائے اصلح کے ماتحت جو اس نسل کے کچھ افراد باقی رہ گئے ان سے اگلی نسل چلی جس میں احساس حیات نے کچھ ترقی کی اور اعصاب حس میں کچھ لوچ پیدا ہوا۔ فنا و بقا کا یہی سلسلہ لاکھوں سال جاری رہا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل، دوسری کے بعد تیسری نسل۔ یہی تھے منزل بہ منزل مدارج ارتقائے حیات یہانتک کہ عہد حجری آیا۔ اس عہد کی آدمی نما نسل پہلے کی سب نسلوں سے اگرچہ زیادہ ذی حس تھی مگر پھر بھی یہ کوئی

متمدن نسل نہیں تھی۔ فطرت جو کاروان حیات کو منزل مقصود ارتقا کی طرف شروع سے آگے بڑھائے چلی جا رہی تھی اسنے عہد ماضی بعید کی تمام نسلوں کے بعد بہ تقاضائے مقصود ارتقا ایک ایسی متمدن نسل پیدا کی جو بستیاں بسا کر آپس میں میل جول کے ساتھ رہتی بستی تھی۔ اسی نسل کے افراد میں وہ تاثر قلبی کچھ کچھ بیدار ہوا جسے جزو فطرت اساس مذہب کہتے ہیں۔ یہیں سے شعور ذات کے ساتھ یہ احساس انسان میں پیدا ہوا کہ دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے اور یہ دنیا کا کارخانہ خود بخود نہیں چل رہا۔ متحرک کو دیکھکر محرک کا خیال اور اسکی جستجو تقاضائے فطرت بشری ہے۔

کسی مرتب سلسلہ کی درمیانی کڑیاں مقصود سلسلہ نہیں ہوتی ہیں، ذریعہ ہوتی ہیں حصول مقصود کا۔ اس اصول ارتقا کے پیش نظر، عالم تخلیق و تکوین کی ہر شے، وہ ثوابت و سیار ہوں کہ عناصر و مرکبات یعنی موالید، براہ ارتقائے حیات ایک ذریعہ ہیں زندگی کو اس منزل ارتقا تک پہونچانے کا جہاں انسان کی آنکھوں سے تمام حجابات جہل اٹھ جائیں اور انسان اپنے مقصود تخلیق کو اپنے سامنے بے نقاب پائے۔ غیر محدود علم و عرفان ہی مقصود حیات انسانی ہے، نظریہ' ارتقا سے اسی حقیقت کا پتا چلتا ہے۔

اگر سننے والے اس سفر نامہ' ارتقا کو صرف ایک داستان ہی سمجھیں تو پھر نہ کوئی مقصود حیات بشری نہ فطرت کی عالم آرائی کا کوئی حاصل کار۔ ایسا نہیں ہے۔ عبثاً قرآن حکیم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ افحسبتم انما خلقنکم عبثاً و انا الینا ترجعون۔ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ ما خلقت ھذا باطلا۔ آدمی کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نہ اسکی زندگی کا کوئی مقصود تخلیق نہ کائنات کا، یہ بھی عبث وہ بھی عبث اور فضول۔

داخلیت کے نقطہ' نظر سے یعنی شعور ذات کے ماتحت وجود حقیقی کا مسئلہ کوئی ناقابل حل معمہ نہیں ہے۔ بیدار شعور ذات جب افکار کو مائل پرواز کرتا ہے تو دل کو اس دنیائے کم و کیف میں اپنا نشیمن کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب چاند سورج اور دنیا کی ہر شے کو فانی پایا تو ساری دنیائے آنی و فانی سے منھ پھیر کر اس سے دل لگایا جو باقی و جاودانی ہے— یہ ہے کامل عرفان توحید اور یہ ہے حقیقی اسلام۔ اب اس سوال کا جواب کہ خالق عالم کون ہے اور کیسا ہے یہی ملتا ہے کہ لیس کمثلہ شی۔ خالق کائنات کی طرح کوئی شے عالم خلق میں نہیں ہے اس لئے یہ سوال بھی

غلط ہے کہ وہ کس شے کی طرح ہے۔ اسکی ذات کائنات سے ماوریٰ مگر کائنات اس سے ماوریٰ نہیں ۔ لا تدرک الابصار وھو یدرک الابصار، نگاہیں اسے نہیں دیکھ سکتیں مگر اسکی نظر میں تمام عالم نظری ہے ۔ اسی سلسلۂ فکر میں یہ بھی غور فرمائیے کہ اللہ نور السموات والارض میں نور کے معنی کسی ایسی روشنی کے نہیں ہیں جو آنکھوں سے نظر آسکتی ہے، نور سے مراد وہ ذات متجلی ہے جسکی علمی تجلی کائنات معلوم کو نہاں خانۂ عدم سے معرض وجود شہود میں لائی ہے ۔ اس شمع قدم کا نور علمی قدیم ہے مگر ارادی انعکاس انوار ممکن الوجود ہے، واجب الوجود نہیں ورنہ عالم بھی غیر فانی اور قدیم ہوتا ۔ ''کل من علیھا فان،، ایک ایسا کلمہ ہے جس کا شاھد ذرہ ذرہ کائنات کی ہر صورت میں ہے ۔ یعنی یہ حقیقت غیر مشتبہ ہے کہ بحیثیت مجموعی کائنات ہر لحظہ مسلسل دور فنا و بقا سے گذر رہی ہے ۔ یہ ہے کائنات کا حدوث مسلسل جس کا فطری مقصود حیات کا وہ ارتقا ہے جو انسان سے ان تمام نقائص کو دور کردے جو مانعِ علم و عرفان ہیں اور انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنادے ۔

انسان کی ھنوز کم شعوری — مقصود حیات سے ہے دوری
کہتا ہے یہ انقلاب عالم — مطلوب ہے جدید آدم
ہے جس کا نشان خود شعوری — بے کار نہیں وہ موج نوری
جو خود کی تلاش میں ہے جاری — فطرت کا اقتضا ہے طاری
ہر علم کا ارتقا یقینی — نزدیک نظر ہے، دور بینی
اٹھنے کو ہیں سب حجاب حائل — خورشید ہے رات کے مقابل
یہ داخلی نقطۂ نظر ہے — پردے ہی میں رات کے سحر ہے

گویا یہ سمجھ میں بات آئی
پردے میں خودی کے ہے خدائی

اسلام اس توحید کے تاثر کو جزو فطرت بناتا ہے، جو عبدیت کا مقام و شرف انسان کے سامنے لاتی ہے۔ بندوں کو خدا بنانا تقاضائے عرفان توحید نہیں ہے ۔ ویدانتی ہمہ اوست کے مقابلہ میں حضرت ابن عربی کا نظریۂ وحدت وجود زیادہ ترقی یافتہ ہے مگر اس میں بھی غلط فہمی کی گنجائش عوام کے لئے ہے۔ اس خطرے کو مجدد صاحب نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ اگر بندوں میں پندار کبریائی پیدا ہوگیا تو اسلام کا یہ مقصود کہ افراد نوع انسانی میں عبدیت کامل کا وہ تاثر پیدا کیا جائے جو تمام فضائل اخلاق و عمل کی اساس

ہے افسانہ ہی ہوکر رہ جائیگا۔ پھر بعثت انبیاء مرسلین کا بھی کیا حاصل سمجھا جاسکیگا جب نیک و بد کا امتیاز ہی اٹھ جائیگا۔ اس لئے انہوں نے نظریۂ ابن عربی کی اصلاح اپنے مکتوبات میں تعلیم وحدت شہود سے کی۔ وہ ہمہ اوست کے بجائے ہمہ از اوست کی تعلیم دیتے ہیں۔ خدا خالق ہے، کائنات مخلوق۔ خالق کا مخلوق پر گمان، گمان باطل ہے۔ ماہیت عالم بتاتے ہوئے وہ نہ کائنات کو وہمی و خیالی شے بتاتے ہیں نہ فریب نظر۔ فرماتے ہیں کہ تمام عالم عدمات کے آئینوں میں اظلالی صفات کا محض انعکاس ہے، مظہر صفات بھی نہیں، جلوہ گر ذات ہونا تو ممکن ہی نہیں۔ثم وراء الوریٰ ثم وراء الذریٰ۔ حضرت مجدد صاحب نے اظلال صفات کا محض انعکاس، عدمات کے آئینوں میں دنیا کی حقیقت بتایا ہے۔ اس قول میں بات ذرا پیچیدہ سے کہی گئی۔ سیدھی صاف بات یہ ہے عالم فانی ہے، عدم سے وجود میں آیا ہے، اسلئے دوامی نہیں ہوسکتا مگر عدم سے وجود میں آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عدم کوئی ایسی شے ہے جس سے خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ کائنات کا غیر مستقل اور عارضی وجود محض امتثالی امر ہے۔ خدا کے ارادہ نے مراد کی شکل پیدا کردی ہے۔ یہی ہیں کن فیکون کے معنی۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ امر کن کا مشار الیہ کون تھا؟ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ مشار الیہ وہ مفہوم مراد ہی تھا جو علم باری میں تھا، اسکی تشکیل ہی اسکی تخلیق تھی۔ یعنی شاہد ہے حدیث اول ما خلق اللہ نوری۔ اگر اس حقیقت پر نگہ ایمانی ہو تو کوئی بحث ہی باقی نہیں رہتی ہے، نہ ہمہ اوست، نہ وحدت وجود نہ تصوریت، نہ مادیت، لا الہ الا اللہ۔ بجز اللہ کی ذات کے کائنات کی کسی شے میں شان الوہیت نہیں، وحدہ لا شریک لہ۔ اسی نقطۂ عرفان سے آغاز معراج عبدیت ہوتا ہے۔ نور انسان کامل ارض و سما، عرش و کرسی ہی کیا ہر دو عالم سے بلند ہوکر معرفت غیر متناہی کی طرف ترقی کرتا چلا گیا اور ہر ہر لحظہ چلا جا رہا ہے— عرش سے گذرے زمانہ ہوگیا—ع زندگی ہے ہر نفس پرواز میں۔ یہ ہے مقصود حیات انسانی اور یہ ہے حیات کا ارتقائے غیر متناہی۔

اقبال کے کلام میں، بظاہر ہمہ منم، وحدت وجود اور وحدت شہود تینوں کا امتزاج ملتا ہے۔ کہیں ان کا نظریۂ خودی، حلاج صفت اناالحق کا موید ہے، کہیں بیخودی میں ابن عربی کا ہمنوا مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ انکی فکر درجہ بدرجہ آگے بڑھی ہے، انکے تاثرات میں تدریجی ارتقا ہوا ہے۔ خود سے چلے ہیں، درمیان میں وحدت وجود کی منزل ہے اور آخر میں وحدت شہود کی۔ مقام عبدیت ان کے سلوک کی منزل مقصود ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عبدیت کا شرف عرفان معبودیت ہی ہے اور چونکہ یہ معرفت غیر متناہی ہے اسلئے معراج عبدیت کی بھی کوئی منزل نہیں ہے۔ ہر نفس حیات مومن سجدۂ جاری ہے جو اس حقیقت کا اعتراف دائمی ہے کہ ذات مسجود و معبود ماورائے فہم و ادراک ہے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے دل سمجھتا ہے وہ سب
دل جسے پاتا ہے اسکو آنکھ پا سکتی نہیں

حواس بشری اگرچہ عالم محسوسات کا انکار نہیں کرسکتے مگر یہ بھی نہیں بتاسکتے کہ اس عالم کم و کیف کی ماہیت و حقیقت کیا ہے۔ سردی و گرمی، سختی و نرمی، جسم و حجم، وزن و مقدار، شکل و صورت، رنگ و بو سب کے سب محسوسات ہی ہیں اور انہیں محسوسات کا مجموعہ عالم کیف و کم کی صورت میں انسان کے سامنے ہے۔ لیکن کیا یہ فریب نظر ہے یا انسان کا محض واہمہ جیسا کہ سو فسطائی کہتے ہیں ع عالم ہے خیال کا مرقع۔ مگر کیا کوئی خواب و خیال اتنا منظم ہوسکتا ہے جس قدر نظام کائنات ہے؟ کائنات آفرینش کی ارتقائی مرتب منزلیں ایک سے لیکر بے شمار، ایک ریاضیاتی تناسب کی شاہد ہیں تو کیا یہ حقیقت صرف ایک وہم و خیال ہی ہے؟ راز و اسرار کا ایک بحر بے پایاں کائنات کی صورت میں نگاہوں کے سامنے ہے مگر طفلانہ فکریں ہنوز موجوں سے کھیل رہی ہیں:

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

عالم محسوسات کی ماہیت کیا ہے؟ اس سوال کو پہلے کیفیات کے تجزیہ سے حل کیجئے پھر کمیات کی تحلیل سے۔ تجزیہ و تحلیل کا نتیجہ جس واحد حاصل تجربات تک پہونچائے وہی اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھا جائے۔ برف سرد اور آگ گرم محسوس ہوتی ہے تو کیا یہ سردی و گرمی برف اور آگ میں بذاتہ پائی جاتی ہے یا یہ دونوں وہ کیفیات ثلاثہ ہیں جو اعصاب حس کے انفعالی اور برف و آتش کے فعل سے سردی اور گرمی کی صورت میں محسوس ہوتی ہیں؟ تجربتاً یہی مانا جاتا ہے کہ نہ سردی برف میں بذاتہ پائی جاتی نہ آگ میں گرمی۔ اس پر قیاس کیجئے سختی و نرمی، رنگ و بو اور جملہ دوسری کیفیات کو، کہ وہ بھی فعل و انفعال کے نتائج ثلاثہ ہی ہوتی ہیں۔ یہی صورت احساس کمیات، یعنی وزن و مقدار اور جسم و حجم کی ہے کہ ان کا بھی جداگانہ وجود معتبر نہیں،

وہ بھی نتائج ثلاثہ ھی ھوتے ھیں ۔ اس تجربہ سے یہ معلوم ھوتا ھے کہ تمام عالم محسوسات کی ماھیت نتائج ثلاثہ کا مجموعہ ھی ھے جو حاصل ھے انفعال اعصاب حس اور ان محرکات کی فعلیت کا جنہیں ھم اشیائے محسوس کہتے ھیں۔ لیکن ان محرکات کی ماھیت کیا ھے؟ آیا وہ مادی ھیں یا غیر مادی؟ ذرات مادی (ایٹم) کا تجزیہ ھمیں غیر مادیت کے قریب پہونچاتا ھے اور یہ بتاتا ھےکہ ایک خاص توانائی (انرجی) ھی تمام محرکات کی اصل ھے، لیکن اگر مادے کے ذاتی اور لازمی صفات، وزن و مقدار، جسمانیت و حجمیت نہیں ھیں تو انرجی کو مادی کیوں سمجھا جائے؟ مادیت اور غیر مادیت میں فرق تو جسمانیت اور غیر جسمانیت ھی کا ھے پھر اگر اصل مادہ کوئی جسم و حجم رکھنے والی شے نہیں تو اسے مادی بلاوجہ سمجھنے کے کیا معنی ھیں؟ اس شرح مادیت سے ھم اس نتیجہ پر پہونچتے ھیں کہ ان تمام محرکات کی اصل جن کا مجموعہ عالم محسوسات ھے ایک غیر مادی بساطت ھے اور اسی بساطت کو اگر اس میں شعور کا وجود بھی تسلیم کرلیا جائے اھل معارف نفس نے نفس کلی بتایا ھے ۔ نفس کلی ھی بہ الفاظ دیگر وہ نور ھے جس کا ظہور تمام مظاھر عالم میں ھے ۔

لیکن کیا داخلیت یعنی شعور ذات (خودی) کے نقطۂ نظر سے نفس کلی ھی کا وجود حقیقی وجود ھے ؟ اس مسئلہ میں تحقیق یہ ھے کہ نفس کلی کا وجود تنویر نور مطلق، ذات متجلی ھے، عین ذات متجلی نہیں۔ یعنی حقیقی وجود واجب الوجود ھی کا ھے، نفس کلی ممکن الوجود ھے، واجب الوجود نہیں، مخلوق ھے خالق نہیں ۔

اگر کلیات استقرائی پر فلسفیانہ افکار کی اساس نہ ھو تو حاصل فکر، قیاسات مع الفارق کے سوا اور کچھ نہیں ھوسکتا مگر مسئلۂ وجود حقیقی میں، وہ کلیات استقرائی، تجربات داخلیت یعنی خودی سے اخذ کئے جا سکتے ھیں جو صحیح تحقیق تک پہونچا سکتے ھیں ۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ۔

ع خود شناسی، خدا شناسی ھے ۔

وحدت مادی، وحدت روحانی (ھمہ اوست یا وحدت الوجود)، تصوریت قدیم و جدید، ثنویت و تثلیث کے مکاتیب فکر میں مسئلۂ وجود پر غیر مختتم بحثیں اسی لئے ھزاروں سال سے جاری ھیں کہ ان میں موضوع فکر بصیرت نفس کو بنانے کے بجائے محسوس بالحواس عالم کم و کیف ھی کو موضوع غور و فکر سمجھا گیا ھے۔ دنیا کی تو خاک چھانی گئی مگر دل کی طرف کان نہیں لگائے گئے،

یہ نہیں سنا گیا کہ یہ صدائے منم (میں ہوں) کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟ کیا یہ اثبات ذات مادے کا فعل ہوسکتا ہے ؟

اگر تو بالیقیں دل میں نہیں ہے
مجھے کیوں اپنے ہونے کا یقیں ہے ؟

ہمارے نزدیک معارف انفس کے بجائے افکار آفاق کو شمع راہ حقائق بنانے کا نتیجہ ہی تمام فلسفیانہ نظریات کے اختلافات میں مضمر ہے ۔ یہی راز ہے کہ قرآن حکیم نے عرفان یعنی ایمان کی طرف سے دلوں کو آواز دی ہے ۔ فلسفہ' انسانیت کے انتہائی عروج سے بہت بلند و بالا وہ منزلت ہے جہاں سے ایمان کی ابتدا ہوتی ہے، پہلے ہی قدم پر دل اس حقیقت کا معترف ہوتا ہے کہ شان الوہیت صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے، کائنات کی کوئی شے بھی اس قابل نہیں ہے کہ مسجود ملائک اسکے سامنے سر جھکائے ۔ یہ ہے وہ عملی خود شناسی جو جامع مکارم و خصائل انسانیت ہے۔ شرک و کفر، الحاد و لادینی کی بنا انسان کی خود فراموشی ہی پر ہے ۔

اقبال نے مسلمانوں کی غلامانہ ذہنیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا، وہ افراد ملت کے اس زوال کا سبب نقطہ' ایمانی یعنی خود قدری سے بعد بعید ہی سمجھے، اس لئے اس مرض وبائی کا علاج انہوں نے دلوں میں جوہر قدر ذاتی کا اجاگر کرنا ہی سمجھا۔ یہ تھا ان کا نظریہ' خودی جو دراصل خودشناسی کی تحریک تھا ۔

داخلیت کے مفہوم پر اس نقطہ' خودشناسی سے جب غور کیا جاتا ہے تو یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ واقعتاً کیا ذریعہ' علم و ادراک سوائے غور و فکر کے کوئی دوسرا بھی ہے؟ یعنی بصیرت نفس یا ذوق وجدان قلب کی بھی کوئی اصل ہے ؟ فطرت نے کائنات کو پہلے تحت الشعور میں پیدا کیا (فی انفسکم افلا تبصرون)، پھر تحت شعور سے عالم محسوسات کی تشکیل کی ۔ یہی سبب ہے کہ صبح و شفق، شب مہتاب و ابر و بہار کے نظاروں کے پردے میں جمال فطرت ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ مناظر کی تصویریں تو صرف پردۂ نظر ہی تک رہ جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے دل میں ان مناظر فطرت کے مشاہدے سے کیفیت انبساط کیوں پیدا ہوتی ہے؟ تاثر جمال شرمندۂ غور و فکر تو نہیں ؟ اسی طرح کے دوسرے تاثرات قلبی سے ہم اس مسئلہ کا حل یہ سمجھتے ہیں کہ ذرائع علم و ادراک دو ہیں: غور و فکر بواسطہ' حواس اور براہ راست

تاثر نفس۔ اسی تاثر نفسی کو وجدان، ذوق دلی یا بصیرت نفسی بھی کہتے ھیں ۔ اور یہ شے قلب بشری کے ساتھ مخصوص نہیں، زندگی کے درمیانی مدارج یعنی بعض حیوانات میں بھی اس ادراک، براہ راست کا سراغ ملتا ھے ۔

پروانے شمع پر یا روشنی پر کیوں جان نثار کرتے ھیں؟ چکور شب مہتاب میں کیوں چاند کی طرف تڑپتی ھے؟ انسان تو انسان جانوروں کو اپنے بچے اتنے پیارے کیوں ھوتے ھیں کہ ان کی حفاظت کے لئے وہ اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کرتے ؟ وجدان کے ثبوت میں صرف تاثرات جمالی ھی کو پیش نہیں کیا جاسکتا، ایسے غیر جمالی مشاھدے بھی ھیں جو ھمیں معترف احساس اندرونی کرتے ھیں ۔ پرند بلی کو دیکھکر کیوں خوف زدہ ھو جاتے ھیں؟ شیر کو دیکھ کر جنگل کے اکثر جانور کیوں جھاڑیوں میں پناہ ڈھونڈتے ھیں؟ اور آگے چلئے، انسانی ادب میں نیکی، شرافت، خدا ترسی، رحم دلی، حسن اخلاق کے عنوانات کس واسطے اور راستے داخل ھوئے؟ یہ تاثرات شرمندۂ غور و فکر تو ھوتے نہیں وجدان بشری تمام تاثرات نفسی کا جامع ھوتا ھے ۔ اس تبصرے سے یہ حقیقت روشنی میں آتی ھے کہ وجدان اپنے تحت الشعور کا شناسائے دیرینہ ھے۔ فرق صرف یہ ھے کہ بعض دوسرے حیوانات میں اسکے ابتدائی آثار پائے جاتے ھیں مگر صحیح الفطرت انسان میں اسنے اتنی ترقی کی ھے کہ معارف الٰہیہ کا دروازہ خود آگاہ انسان کے سینے میں کھل گیا ھے ۔ جو لوگ یہ سمجھتے ھیں کہ بندگی یا تاثر عبدیت کی بنا خوف پر ھے وہ عبدیت کی روح سے نا آشنا اور بیگانہ ھیں ۔ جمال فطرت جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ھے تو کیا یہ کشش بغیر محبت دل میں پیدا ھوتی ھے؟

دیکھا نہ تم نے آنکھ اٹھا کر یہی سہی
اپنی نظر کے سامنے میں آپ آگیا

اس مشاھدۂ جمال کا اثر کبھی کبھی حساس دلوں پر اتنا چھا جاتا ھے کہ اھل شہود اپنے آپکو ڈھونڈتے ھیں مگر اپنا پتہ نہیں ملتا، کائنات محسوسات تو کس شمار میں ھے۔ یہ ھے ذوق وحدت شہود جو شرمندۂ غور و فکر نہیں ۔ نہ یہاں دلائل و براھین کی ضرورت نہ دلیل و حجت کا کوئی کام ۔ آفتاب جب طلوع ھونے لگتا ھے تو ستاروں کی دنیا نظروں سے اوجھل ھو ھی جاتی ھے ۔ یہ آیت قرآن حکیم قائلین وحدت الوجود صوفیائے کرام اس عقیدے کی صحت کے ثبوت میں پیش کرتے ھیں: ھو الاول والاخر، والظاھر والباطن وھو بکل شیء علیم۔ حالانکہ یہ آیت بین طور پر شاھد وحدت شہود ھے۔ اس اجمال

کی تفصیل یہ ہے کہ اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ خدا کو ہر شے کا علم ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا بذاتہ اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے تو کسی شے کا کوئی جداگانہ وجود ہی نہیں رہا، پھر بکل شیء علیم کا مفہوم کیا سمجھا جاسکتا ہے ؟ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا کو ہر شے کا علم ہے، اسکے علم سے کوئی شے باہر نہیں ہے چونکہ اسکا علم حضوری ہے اسلئے اسکا ہر معلوم اسکے علم میں ہے، تمام کائنات جو مجموعہ ہے معلومات الٰہیہ کا وہ کوئی خارجی شے نہیں۔ خدا اپنے مشاہدات کا شاہد ہے۔ یہ ہے وحدت شہود نہ کہ وحدت الوجود ۔ غور فرمائے! وہ اپنے معلومات علمی کا مشاہدہ کر رہا ہے ۔ یہ مشاہدہ وحدت شہود نہیں تو اور کیا ہے؟ وحدت الوجود کے عقیدے سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اس لئے کہ علم پر ذات علیم کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے بالخصوص اس صورت حال میں کہ خدا کا علم غیر متناہی اور کائنات محدود ہے، محدود پر غیر محدود کا اطلاق کوئی معنے ہی نہیں رکھتا ہے ۔ وحدت الوجود کے عقیدے میں ایک خاص نقص یہ ہے کہ یہ عقیدہ افراد انسانی کی وہ انفرادیت باقی نہیں رکھتا جس پر تمام فضائل اخلاق و عمل کی بنا ہے اور تمام فرائض کی ذمہ داری انسان اسی کی بنا پر محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ انسان کا کوئی انفرادی وجود ہی نہیں ہے، خدا ہی خدا ہے تو اسکی ذمہ داری بھی کچھ نہیں ۔ کسی فریضہ اخلاق و عمل کا ادا کرنا اسپر واجب کیوں ہو جب اسکے بجائے خدا ہی کے ذمہ اسکے فرائض ہوجائیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی سعی و عمل کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے ۔ حالانکہ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ لیس لانسان الا ماسعیٰ یعنی انسان کا کام کوشش ہی ہے۔ پھر بعثت انبیاء کا مقصود بھی کیا سمجھا جاسکتا ہے ؟ اس عقیدہ کے خلاف نظریہ وحدت شہود میں ہر ہر فرد انسانی اور اسکی انفرادیت ایک ایسی صورت معلوم الٰہی ہے جو اہل فہم و بصیرت اور ذی قصد و ارادہ ہے، دنیائے علم و عمل میں اس کا ایک خاص مقام ہے، اسکے ذمہ متعدد حقوق اپنے پرائے، اہل و عیال اور ابنائے جنس کے ہیں جن کا ادا کرنا اسپر فرض ہے ۔ خدا نے اسکو نیک و بد کا امتیاز عطا فرمایا ہے، علم و عمل کی صلاحیت بخشی ہے، انہیں صلاحیتوں سے اسکی انفرادیت مخصوص ہوتی ہے اور اسی تجسس سے اسکے فرائض اسپر عاید ہوتے ہیں اور اسکی ذمہ داریاں اس سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ راہ حیات میں منزل سے باخبر ہوکر قدم بڑھائے۔ اسکے اعمال کے قدرتی نتائج اپنے وقت پر اسکے سامنے آنے والے ہیں ۔ لیکن اگر انفرادیت نہیں تو مکافات عمل بھی نہیں اور پھر انسان مکلف بھی نہیں، جو چاہے کرے۔ وہ بجائے خود نہ کچھ

ہے، نہ خود کچھ کرتا ہے، پھر کیسی جزا اور کیسی سزا! یہ ہے عقدۂ وحدت الوجود اور وحدت شہود کے درمیان وہ فرق جو انسان کے اخلاق و عمل پر اثر ڈالتا ہے۔ وحدت شہود عرفان معبودیت کے ساتھ پیام عبدیت ہے اور وحدت الوجود اپنی انفرادی ہستی کو گم کر دیتا ہے ع عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ مگر بندگی میں جو بیخودی کسی مستغرق حال بندے پر طاری ہوتی ہے اسکا مشاہدۂ وحدت کچھ اور ہوتا ہے۔ لا موجود الا اللہ کے معنی اسکا دل ہی جانتا ہے مگر فلسفیانہ دلائل سے جس وحدت الوجود کا اثبات کیا جاتا ہے، عملی زندگی کو وہی بے جان بناتا ہے اور فرائض اخلاق و عمل سے وہی بیگانہ بناتا ہے۔ عہد سعادت میں نہ وحدت الوجود کا تصور کسی مرد مومن کے دماغ میں تھا نہ وحدت شہود کا خیال دل میں، وہ توحید جسکی بنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشاہدۂ قلبی پر ہے اسی کا پیام قرآن میں اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔ اس پیام کا جزو اول نفی شرک ہے اور جزو دوم اثبات توحید۔ لا الہ کے بعد الا اللہ ہی مذہب توحید خالصاً ہے۔ یہ ہے تحقیق اس باب میں کہ نہ ہمہ کو اوست سمجھو نہ اوست کو ہمہ، کائنات کا وجود فانی اور خدا کا وجود باقی۔ نہ فانی کو باقی سمجھو، نہ باقی کو فانی۔

یونانی فلسفہ' مابعد الطبیعیات کا جب ترجمہ یونانی زبان سے عربی میں ہوا تو یہ بحث چھڑکر مدرسوں سے خانقاہوں تک پہونچی کہ ماہیت وجود کیا ہے؟ اسی بحث کے ساتھ ساتھ ذات و صفات کے مسائل بھی متکلمین کی زبانوں پر تھے، مشاہدۂ قلبی کی جگہ علم لاکثر، دلائل و قیاسات فکری نے لے لی تھی اور یہی وہ شے تھی جسنے روح توحید کو دلوں میں ضعیف کردیا۔ کہاں فاتح خیبر کا علانیہ جذبہ' توحید اور کہاں بوعلی سینا کا فلسفہ عقول عشرہ به اشارات۔

ہندوستان میں صدیوں کے بعد کہنا چاہئے کہ حضرت مجدد صاحب نے پھر وحدت شہود کے نام سے اسی توحید کا علم بلند کیا جسکو حضرت جعفر طیار نے دونوں ہاتھ کٹ جانے کے بعد بھی سینے سے لگائے رکھا تھا۔ یہ تھا توحید کا وہ جذبہ جسپر شہدائے بدر و احد اپنے آپ کو ہزار جان سے قربان کرگئے اور یہ بتا گئے کہ فدائے حق ہو جانا ہی خدا شناسی ہے۔ مگر یہ جذبہ ایمان ہی سے پیدا ہوتا ہے، قیاس آرائیوں سے نہیں۔ لیکن غور و فکر مانع ایمان کوئی شے نہیں، صلاحیت فہم و بصیرت اپنے اپنے مقام پر نہایت اہم جزو حیات عطیات باری تعالی ہیں۔

ان لوگوں کی قرآن حکیم میں تعریف کی گئی جو تخلیق ارض و سما پر غور کرنے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ پروردگار یہ کائنات تونے عبث پیدا نہیں کی ہے، اسکی تخلیق کا ضرور کوئی مقصد انتہائی ہے ۔ اس آیت میں تخلیق ارض و سما پر غور و فکر کو علامت ایمان بتایا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ خدا کو کھڑے بیٹھے اور اپنی ہر کروٹ پر یاد کرتے ہیں وہی تخلیق ارض و سما پر غور کرکے یہ محسوس کرتے ہیں کہ تنظیم عالم بے غایت و مقصد نہیں ہے ۔ اس تعلیم کے پیش نظر مفکرین اسلام کا مسائل تخلیق پر غور کرنا متقضائے ایمان ہی رہا ہے ۔ البتہ نتیجہ فکر کی صحت کا ایک معیار بھی قرآن حکیم میں بتایا گیا ہے اور وہ معیار حضرت ابراہیم علیہ السلام و سرور و سید الانبیا حضرت محمد رسول اللہ کا عالم موجودات میں شہود توحید ہی ہے یعنی ایک بے مثل و مثال شان احدیت کا مشاہدہ ۔ نہ وہ کسی شے کی طرح ہے نہ کوئی شے اسکی طرح ہے ۔ عالم فانی کے چاند اور سورج کو دیکھکر حضرت ابراہیم کی زبان پر لا احب الافلین تھا یعنی مجھے کسی فانی شے سے محبت نہیں ہے، میں کسی فانی شے کو خدا نہیں سمجھ سکتا ۔ اس نتیجہ تک فکر بشری جبھی پہونچ سکتی ہے جب ذوق ایمانی و حیاتی معاون فکر ہو ورنہ دامن فکر خار زار اوہام میں الجھکر رہ جاتا ہے اور مفکر کی قوت عمل گرفتار کم و کیف ہوکر سست و پست ہو جاتی ہے اور وہ زندگی بھر کم و کیف ہی کی ادھیڑ بن میں رہتا ہے ۔ اگر مجاہدین عہد سعادت ان الجھنوں میں مبتلا ہوتے تو راہ حق میں وہ قربانیاں محال تھیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے مسائل اور وحدت و تثلیث کی غیر مختتم بحثیں کرنے والوں کو حیران کردیا اور دماغ الٹ دئے ۔ کہاں توحید کا بحر مواج اور کہاں تثلیث کے خار و خس ۔ ملت اسلامیہ کے زوال کا ایک خاص سبب یہی ہے کہ لوگوں میں وہ جذبۂ توحید باقی نہیں رہا جو فاتح عالم تکثیر کا تھا اور یہ ہوا جبھی کہ جب فکریں اپنے داخلی جذبۂ ایمانی سے جدا ہوکر دنیاکی بھول بھلیوں میں پڑ گئیں ۔

تو صحیح مسلک فکر یہ ہے کہ حقائق عالم پر داخلیت کے نقطۂ نظر سے براہ فکر غور کیا جائے کہ یہی مقام مشاہدۂ عبدیت ہے اور اس راہ شہود میں طالبان تحقیق کو کسی دوسرے مفکر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ۔ قرآنی تعلیم، اسوۂ رسول ، سیرت و روش آل و اصحاب قافلے والوں کے سامنے ہے ۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ انسان بڑا عارف ہے جو اناالحق کہنے کے بجائے اس بات کا عملی ثبوت دے کہ وہ انسان ہے ۔ مکمل نشان انسانیت کامل عبدیت ہی ہے ۔ خود آگاہی کے بعد ہر سجدۂ مرد مومن عرش کا تارہ

ہوتا ہے، گرد آوارہ نہیں ہوتا ۔ تسخیر ارض و سما انسان کا راستا اور معرفت باری تعالی منزل مقصود ۔ لیکن یہ تسخیر ارض و سما نہیں کہ انسان خود مسخر ارض و سما (مادہ اور مادیات) ہوکر منکر خدا ہو جائے۔ یہ ارتقائے حیات نہیں، یہ ترقیٔ معکوس ہے۔ توصیف انسان کامل، بروئے تعلیم قرآنی، انسان مکمل خیر البشر ہے فوق البشر نہیں ۔

۱ — انسان کا وہ امتیازی شرف جسکی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات سمجھا جاتا ہے تمام عالم موجودات کا علم یعنی علم الاسما ہے جسکا نقطۂ آغاز، خود نگاہی، خود شعوری یا خود شناسی ہے ۔ علم الاسماء علم حقائق موجودات ہے۔ اسی علم سے مشرف ہوکر آدم مسجود ملائک و تاج در عالم ہیں ۔

۲ — خود سے مراد وجود انسان کی اصل و حقیقت، نفس ذات، انائے بشری یا وہ جوہر ہے جس کا تکیف انسان میں اسکی خودی ہے (انگریزی زبان میں ego or self)

۳ — اس غور و فکر کے لئے کہ تمام عالم ظاہر و باطن کی حقیقت و ماہیت کیا ہے دو راستے ہیں ۔ قریب بہ حواس پہلا راستا آفاق یعنی عالم محسوسات سے انفس کی طرف جاتا ہے اور دوسرا انفس سے آفاق کی طرف یعنی خودی سے خدائی کی سمت جاتا ہے ۔

۴ — پہلے راستے سے تلاش حقیقت کا نتیجہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ متجسس نگاہیں نفس انسانی (مرکز انائے بشری یعنی خودی) کے کسی امتیازی وجود کی منکر ہو جاتی ہیں یا اسے بھی کوئی مادی کیفیت سمجھتی ہیں اور اس غلط فہمی کی خاص وجہ یہ ہے کہ عالم محسوسات میں کوئی دوسری شے نفس انسانی کی مماثل نہیں پائی جاتی ہے ۔ اسی مقام انکار سے آغاز ہوتا ہے حقیقت مطلق (ذات باری) کے انکار کا ۔ خود فراموش آدمی ہی خدا فراموش ہوا کرتا ہے۔ دوسرے راستے یعنی عرفان نفس سے جب حقیقت عالم کی جستجو کی جاتی ہے تو آفاق یعنی عالم محسوسات ایک آئینۂ مشاہدات ہی نظر آتا ہے ۔

۵ — کائنات اگرچہ نہ کوئی خیالی شے ہے، نہ تصورات کا مجموعہ یا فریب نظر مگر اس کا وجود حادث ہے وہ قدیم نہیں ۔ مخلوق فانی،

خدا باقی، مخلوق حادث، خدا کی ذات قدیم، مخلوق کا وجود ممکن، خدا کا وجود واجب۔

۶ — اس کلیہ کا مفہوم کہ شے سے شے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ خالق نے مخلوق کو اپنے ارادے سے پیدا کیا ہے، اللہ تعالے کے ارادۂ تخلیق ہی نے صورت مراد یعنی اصل کائنات میں جان ڈالی ہے، حقیقتاً کائنات امتثالی امر ہے۔ کن فیکون کی تفسیر داخلیت یعنی بصیرت نفسی کے نقطۂ نظر سے اس حقیقت کی شاہد ہے کہ خدا کی ذات امر ابداع میں ہر دوسرے واسطہ سے بے نیاز ہے۔ خدا کا ارادہ اور امر ہی وہ شے ہے جو مخلوق کی جان ہے، صمدیت، احدیت کی صفت ذاتی ہے، وہ خدا ہی نہیں جو کسی شے کا محتاج ہو۔

۷ — توحید کی ابتدا نفی شرک ہے اور انتہا وہ اثبات ذات ہے جو ماورائے قیاس ہے۔

۸ — اگرچہ عقیدۂ وحدت الوجود بھی خلاف شرک ہے مگر اس عقیدے کو بہ تمام کمال ہمہ اوست کے معنوں میں صحیح تسلیم کرنے کے بعد انسان میں وہ امتیاز انفرادیت باقی نہیں رہتا ہے جو انسان کو اسکے تمام فرائض اخلاق و عمل کا ذمہ دار بناتا ہے اور اسی کی تحریک سے ہر خود آگاہ انسان فروغ انسانیت کیلئے کوشاں اور ہر منافیٔ آدمیت عمل سے گریزاں رہتا ہے۔ ہر اس عمل کی بنا جو ننگ انسانیت ہو خود فراموشی یا اعزاز نفس کی گم گشتگی پر ہوتی ہے۔ جب خدا کے سوا کسی شے کا کسی طرح کا وجود ہی معتبر نہ ہو تو انسان کے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ہی کیا باقی رہتی ہیں۔ اس غلط فہمی سے ایک طرف سعی و عمل کی راہ مسدود ہو جاتی ہے اور دوسری طرف کوئی منزل مقصود حیات نہیں رہتی ہے۔ غرضکہ فکری نظریۂ وحدت الوجود کا رد عمل وہ تاثر عبدیت انسانی میں باقی نہیں رکھتا ہے جو واحد راستا ہے معراج انسانیت کا اور اسی راستے کی طرف قرآن حکیم اور اسوۂ رسول کریم نے کاروان ملت اسلامیہ کو بلایا ہے۔ اس پیغام کا حاصل ایمان اور عمل صالح ہے مگر وہ قائلین وحدت الوجود جنکی باطنی اور ذوقی نظر عالم محویت و استغراق میں محو شان ذات

باری میں ہوتی ہے وہ فکری وحدت الوجود کے ہر رد عمل سے بری پائے گئے ہیں۔ وہ یقیناً سراپا جامع مکارم انسانیت ہی ہوتے ہیں۔

۹ — وحدت مادی کے پرستاروں کو نہ خدا کا یقین نہ خودی (اعزاز نفس) کی پروا۔ خود غرض زندگی، تحفظ حق و حقوق کے لئے جان دینا، بلاشبہ یہ مغالطہ انسان کی حقیقی زندگی کو مرگ دوام میں تبدیل کر دیتا ہے۔

۱۰ — عقیدۂ وحدت شہود، وحدت الوجود روحانی اور وحدت مادی دونوں کا مصلح ہے۔

۱۱ — وحدت حقیقت انسانی ایک صحیح اور حقیقت پر مبنی نظریہ ہے کہ اس سے انسان کا مرتبہ کائنات میں معلوم ہوتا ہے۔

۱۲ — وحدت شہود سے بھی بلند و بالا عقیدۂ توحید ہے کہ وہ خدا کی ذات یعنی اسکی احدیت کو تمام عالم و عالمیان سے ماورا بتاتا ہے، اسکی ذات بے مثل و مثال ہے، وہ کائنات مخلوق سے ماورا ہے، کائنات مخلوق اس سے ماورا نہیں۔ مخلوق جو اپنی تخلیق میں محتاج خالق ہے خالق سے ماورا نہیں ہوسکتی۔

۱۳ — وجود حقیقی خدا ہی کا وجود ہے اور جو کچھ ہے، محسوس ہو کہ معقول، خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور اسی کے ارادہ کی تشکیل ہے۔ اس کی خلاقی تعجب خیز ہے۔ خالق کے ارادے کو خلق کے ارادوں پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔

۱۴ — انسان کے دل میں بصیرت کی جو ایک شعاع نوری ہے وہی نور مطلق (ذات باری) کی طرف لے جاتی ہے۔ فکر بشری اگر اس شعاع نوری کی روشنی میں منزل علم و ادراک میں بڑھی چلی جائے تو منکر مقصد تخلیق (معرفت باری تعالیٰ) کبھی نہیں ہوسکتی۔ اسی شعاع نوری کا نام تکیف و شعور ذات، انائے بشری یا خود کا تاثر خودی ہے۔

۱۵ — مطالعۂ صحیفۂ فطرت کتاب نفس ہی کے مطالعہ سے شروع ہوتا ہے اور اس مطالعہ ہی کو خود شناسی کہتے ہیں۔

۱۶ — خود کو بھلا کر خدائی میں اپنے آپکو تلاش کرنا مردان خدا کا مسلک نہیں، یہ کھلی گمراہی ہے۔

۱۷ — مرد مومن کا ارتقائے خودی یہ ہے کہ اپنے حلقۂ انفرادیت (دائرۂ ذات) میں تمام افراد ملت کو بالخصوص اور تمام نوع انسان کو بالعموم شامل کرلے، سب کا دکھ درد اپنا دکھ درد معلوم ہو، خلق خدا کی بھلائی خود اسے اپنی بھلائی معلوم ہو۔ اسکی انفرادیت کی مثال دریا کی سی ہو کہ دریا کسی موج کو اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا ہے:

انسان تو بے درد نہیں ہے انساں پر سوز ہے، دل سرد نہیں ہے انساں
یہ رحمت عالم نے بتایا ہے ہمیں کل نوع ہے اک، فرد نہیں ہے انساں

نمرودیت و فرعونیت خودی کی ترقیٔ معکوس ہے ارتقا نہیں۔ حقوق العباد کا اتلاف اور خود آگاہی کا دعویٰ اجتماع نقیضین ہے جس کا تصور بھی محال ہے چہ جائیکہ وقوع۔ محکم حدیث خیر الناس من ینفع الناس، سب سے اچھا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ سب کے کام آئے، سب کے دکھ درد میں شریک ہو۔ یہ ہے عملی ارتقائے افادیت جو ہمارے نزدیک صحیح ارتقائے خودی ہے۔ خیالی عالم میں اپنی ہستی کو سمندر سمجھ لینا مگر کسی پیاسے کے کام نہ آنا نہ انسانیت کا اقتضا ہے نہ خودی کا ارتقا، صرف ایک فریب تخیل ہے۔ خود شناسی و خدا شناسی ضرور ہے مگر یہ خدا شناسی نہیں کہ پڑوس میں یتیم بچے تو رات بھر سردی کے مارے اکڑتے اور چیختے رہیں اور کوئی مدعی خود آگاہی شب بھر حریر و دیبا کے نرم و گرم لحاف میں داد عیش و آرام دیتا رہے۔

۱۸ — حاصل مقالہ، تاثر توحید کا نقطۂ آغاز یا صحیفۂ معرفت کی بائے بسم اللہ شعور ذات (Self-Consciousness) ہے اور اسی تاثر داخلی سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ حقیقی وجود حقیقت مطلق ذات باری تعالیٰ ہی کا ہے۔ توحید مکمل انتہائی ترقی یافتہ تاثر عرفان حقیقت ہے جس سے اوپر دوسرا کوئی مقام معرفت نہیں ہے اور اس مقام تک شعور نفس انسانی درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا

بکثرت مدارج حیات و موجودات سے گذرتا ہوا پہونچا ہے۔ زمانۂ ماضیٔ بعید کی آدمی نما نسلوں کی ذہنیت کا مقابلہ بیسویں صدی کے انسان کی اس ذہنیت سے کیجئے جسنے فطرت کے متعدد حقائق کو بے نقاب کرلیا ہے۔ یہ حقیقت آپ کو محتاج دلائل قیاسی نہیں معلوم ہوگی کہ زندگی کی ایک موج ارتقا ہے۔ مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ حیات انسانی میں اب کوئی خامی باقی نہیں ہے اور اسکی فطرت فائز مقصود حیات ہوچکی ہے۔ خلاف تاثر توحید اور بہت سے مشرکانہ توہمات ہنوز نسل انسانی میں پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ جہل علم نما یعنی جہل مرکب کی صورت میں ہیں اور کچھ ان غلط روایات کی صورت میں جن پر جہل کی وجہ سے ایمان لایا گیا ہے۔ مگر روش ارتقائے علم و ادراک یہ بتاتی ہے کہ ایک دن تمام مواقع ادراک حقیقت دور ہوکر رہینگے اور انسان کو فطرت اسکے مقصود حیات تک پہونچا کر رہیگی اور وہ مقصود ہر شک اور شبہ سے بری غیر متناہی معرفت باری تعالی ہی ہے۔ حقیقی دین ابراہیمی اور محمدی ہی ہر انسان کا مذہب ہوگا اور جب یہ ہوگا تو ہر فرد بشر کے اخلاق و اعمال بھی عرفانی ہی ہونگے، ظلماتی نہ ہونگے۔ زندگی کے غیر محدود ارتقا کا تقاضا ہے، اسے خیالی امیدوں پر مبنی نہ سمجھنا چاہئے۔

مشاہدات وحدت شہود کا خلاصہ صرف ان دو جملوں میں ہے :—

۱ — تمام خدائی کا وجود اضافی ہے یعنی ظلی

۲ — مگر خودی کا وجود اقاضی ہے۔

با الفاظ دیگر عالم کائنات کی مثال سائے کی سی ہے اور انائیت کی مثال شعاع ذات کی سی اسلئے شعاع کی داخلیت ہی سے شہود اللہ نور السموات والارض ممکن ہے۔ دنیا کی خاک چھاننے سے یہ گوہر معارف ہاتھ نہیں آسکتا۔